Research Journal
Tahqeeqat
جلد:4، شمارہ:2، 2025ء
eISSN: 2791-0342
pISSN: 2791-0334
ریسرچ جرنل
تحقیقات

آپ بیتی "گئے دن کی مسافت" فکری و فنی خدوخال

Autobiography "Gaye Din Ki Musafat" – A Thematic and Technical Overview

Muhammad Hamza Muneer
Lecturer, Akhuwat College, Kasur

محمد حمزہ منیر
لیکچرار، اخوت کالج، قصور

Abstract

Autobiography generally refers to the arrangement of life events in which the author proudly mentions their family and personal experiences. Shahid Hamid's excellence lies in the way he has maintained simplicity and sincerity in his autobiography, making it seem like a truthful narrative. The events are presented in such a dramatic style that they take the shape of fiction. The style of the autobiography is easy to understand, and the reader doesn't feel bored at any point. Apart from the central characters, secondary characters, religious movements, political movements, students' political activism, and political activities are presented in such a beautiful way that the autobiography reflects the colours of history. The way events are presented, it seems as if the author has contained it in a nutshell. Specifically, the events of the freedom movement and post-partition, educational system, and post-migration circumstances perfectly reflect the stages Pakistan went through and the sacrifices made. Generally, autobiographies are a complete reflection of the era's events and circumstances. They provide a personal perspective, offering insights into historical events, cultural norms, and societal values of the time, enriching our understanding. Shahid Hamid's autobiography is a remarkable example of this-

Keywords: *Autobiography, Shahid Hameed, Critical Analysis, Language and Expression, Religious Undertones, Idiomatic Sayings ,Style, Jalandhar*

کلیدی الفاظ: آپ بیتی، شاہد حمید، تنقیدی، زبان و بیان، مذہبی رنگ، ضرب الامثال، اسلوب، جالندھر

آپ بیتی کسی شخص کی ایسی داستان حیات کو کہتے ہیں جسے اس نے ازخود قلمبند کیا ہو آکسفورڈ ڈکشنری میں Autobiography کی تعریف یوں ہے:

"The story of person's life written by that person"(1)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی آپ بیتی کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"آپ بیتی احوال و واقعات کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ اکثر اوقات لکھنے والے کی داخلی کیفیتوں، دلی احساس، شخصی اور عملی تجربوں، زندگی کے جذباتی پہلوؤں اور بحثیت مجموعی زندگی کے بارے میں اس کے نقطہ نظر کی ترجمانی کرتی ہے"۔(2)

آپ بیتی میں مصنف کے احساسات و خیالات اور جذبات و تجربات کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ ان میں صرف ان واقعات کا احاطہ کیا جاتا ہے جس سے اس کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہو۔ یقیناً اردو ادب کی آپ بیتیوں میں یہ کمزور پہلو موجود ہے کہ مصنف اپنی ذات کے بارے میں سب کچھ بتا دینے سے گریز کرتا ہے اور دنیا کے سامنے اپنی شخصیت کے صرف وہی پہلو پیش کرتا ہے جن سے اس شخصیت کا مثبت رخ سامنے آئے اور لوگ اس کی ذات سے متاثر ہو کر اس کے بارے میں بہتر رائے قائم کریں۔ انکشاف ذات کے اس مرحلے پر سچائی کا دامن تھامے رکھنا از حد ضروری ہے اور یہی سچا اظہار ذات کسی بھی مصنف کے لیے بہت مشکل کام ہے۔ آپ بیتی لکھنا درحقیقت ایک مشکل کام ہے اس میں مصنف کو سچائی کا دامن نہایت مضبوطی سے تھامنا پڑتا ہے۔

INTERNATIONAL STANDARD SERIAL NUMBER INTERNATIONAL CENTRE
اشاریہ اردو جرائد
OPEN ACCESS
HEC
DRJI
EuroPub

آل احمد سرور اس بارے میں لکھتے ہیں کہ جینا ایک فن ہے اور خود نوشت فن لطیف اس سے عہدہ بر آ ہونے کے لیے بڑی سچائی بڑے ریاض اور بڑے کھرے پن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا راستہ بھی ایسے ہے جیسے پل صراط کی طرح بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہوتا ہے۔(3)

ڈاکٹر سید شاہ علی کے نزدیک آپ بیتی ایک معتبر صنف ہے۔ آپ بیتی ہی نہیں بلکہ کسی بھی صنف یا تحریر میں اسلوب کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ صنف آپ بیتی میں اسلوب اور شخصیت میں پایا جانے والا ایک گہرا ربط نمایاں نظر آتا ہے۔ آپ بیتی جس قدر سادہ اور سلیس انداز میں تحریر کی جائے گی اس قدر اس میں دلچسپی کا عنصر شامل ہوگا۔ ہر انسان کی اپنی شخصیت ہوتی ہے جو اوصاف کے اعتبار سے دوسروں سے قطعاً مختلف ہوتی ہے۔ اسلوب شخصیت کا عکاس اور ترجمان ہوتا ہے۔ مصنف کے انداز فکر کا مظہر ہونے کے ناطے اسلوب کی اہمیت آپ بیتی میں بہت بڑھ جاتی ہے۔ آپ بیتی کی تکنیک کا جائزہ لیا جائے تو ضخامت کا کوئی معیار ناقدین نے طے نہیں کیا کہ جسے سامنے رکھ کر آپ بیتی کے اوراق متعین کیئے جائیں۔ اس سلسلے میں یوسف جمال انصاری لکھتے ہیں:

"آپ بیتی خواہ چند سطروں پر مشتمل ہو خواہ سینکڑوں صفحات پر محیط بہر حال آپ بیتی ہوتی ہے"۔(4)

سوانح عمری کے مقابلے میں آپ بیتی لکھنا ایک مشکل فن ہے۔ سوانح عمری میں دوسروں کی زندگی پر ہنسنے کے موقع ملتے ہیں جو شاید دنیا کا آسان ترین کام سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ آپ بیتی میں مصنف کو اپنی ذاتی زندگی کے رازوں سے پردہ اٹھانا ہوتا ہے اور اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو خوش دلی سے دنیا کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے جو کہ یقیناً ایک مشکل کام ہے۔ آپ بیتی لکھنے والے کو یہ مشکل فریضہ بھی سر انجام دینا ہوتا ہے۔ آپ بیتی میں سچائی کا عنصر سوانح عمری کی نسبت زیادہ کار فرما ہوتا ہے اور پڑھنے والا زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بے لاگ سچائی کو پڑھنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوانحی عمری کی نسبت آپ بیتی کو زیادہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ جبکہ سوانح میں سوانح نگار ہیرو سے مرعوب ہو کر بعض اوقات اسے فرشتہ ثابت کرنے کی سعی کرتا ہے۔ جس سے مبالغہ آرائی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور سوانح نگار سچائی کے جادہ سے پرے جانکلتا ہے اور یوں قاری کے لیے تحریر میں دلچسپی ماند پڑنے لگتی ہے۔ سچ لکھنے کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ بیتی لکھنا کڑوا گھونٹ پینے کے مترادف ہے۔

شاہد حمید کا تعلق آرائیں خاندان سے ہے۔ وہ 1928 میں نکودر، جالندھر کے ایک گاؤں پر جیاں کلاں میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی اس کے بعد لاہور آ گئے۔ انگریزی میں ایم۔اے کیا اور درس و تدریس کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔ انھوں نے پنجاب کے مختلف کالجز میں پڑھایا اور 1988ء گورنمنٹ کالج لاہور سے بطور پروفیسر ریٹائرڈ ہوئے۔ وہ نہ صرف ایک اچھے ادیب ہیں بلکہ ایک اچھے مترجم بھی ہیں۔ گئے دن کی مسافت ان کی یادوں، گزرے ہوئے لمحات اور تجربات پر مشتمل ہے۔ یہ تجربات خوشگوار بھی ہیں اور بعض تلخ بھی ہیں۔ لیکن اس مختصر آپ بیتی کے 263 صفحات ہیں انہوں نے اپنے تمام حالات وواقعات کو اس طرح تحریر کیا ہے گویا کوزے میں دریا بند کر دیا ہو۔

اپنا تعلیمی دورانیہ بچپن، عزیز واقارب، مصنف، ادباء سیاسی حالات، معروف سیاستدانوں کے بارے میں مختصر بیانات، اکابرین علمائے دیوبند، اہم شخصیات کا تعارف اور ان کے چیدہ چیدہ کارنامے اور تعارف الغرض ہر چیز کو آپ بیتی میں جگہ دینے کی کوشش کی ہے۔ جو کہ ایک اعلیٰ پائے کے مصنف ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے بچپن کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے خاص طور سے اپنے عزیز واقارب کا تذکرہ کیا ہے یعنی وہ انہیں اب تک نہ بھولے ہیں اور نہ ہی ان کو نظر انداز کیا ہے۔ بلکہ ان میں سے چند ایک تو ہندو گھرانے سے بھی تعلق رکھتے تھے لیکن مصنف نے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس میں گزرے وقت میں ان لوگوں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ بیتی کا مثبت پہلو ہے کہ انہوں نے بلا تفریق اپنے ساتھ منسلک ہر امیر غریب رشتے دار، ان کے تعلق دار خواہ وہ ہندو طبقے سے ہی کیوں نہ تعلق رکھتا ہو اس کا ذکر بھی آپ بیتی میں کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ

ان آرائیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو موقع پڑنے پر ہر بار اپنی وفاداریاں تبدیل کر لیتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو موقع پرست، واقع ہوئے ہیں ان میں بڑی مثال میاں عبدالرب کی ہے جنہیں گاؤں والوں نے اسمبلی کا ممبر بنایا لیکن اس کے باوجود وہ یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے پھر یہ کہ عزیز و اقارب کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ ایک مناسب حد تک ان سب کا تعارف بھی کروایا ہے۔ جن میں غلام رسول، محمد علی بوٹی والے، دو سگے بھائی ولی محمد اور غلام رسول، منشی احمد بخش، پہلی جماعت کے استاد، احمد بخش کا ذکر کر کے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ مصنف اپنے ماضی کے ساتھ مکمل طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ آپ بیتی ان کی زندگی کی تمام جہتوں کا احاطہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس میں تعلیمی مسائل، ہجرت کے واقعات سے لے کر قیام پاکستان کے بعد تک کے واقعات و حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اکثر جگہوں پر مختلف ادوار کا آپس میں موازنہ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ آپ بیتی اس حوالے سے دوسری آپ بیتیوں سے مختلف نظر آتی ہے کہ جس میں مصنف اپنی اچھائیوں اور اچھے کام کی ذمہ داری تو خود لیتا ہے لیکن ہر ایسا فعل جس میں کوئی خامی ہو اس کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال کر خود کو بری الذمہ قرار دیتا ہے۔ اگر اس آپ بیتی کا دیگر آپ بیتیوں کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو ہمیں اس میں ایک انفرادیت نظر آتی ہے۔ واقعات کو پڑھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ حقیقت پر مبنی ہیں شاہد حمید صاحب کا تعلق آرائیں خاندان سے تھا لیکن اس میں بھی انہوں نے کسی قسم کے مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے بلکہ یہاں تک لکھ دیا ہے کہ آپ انہیں ڈرا کل یا بزدل بھی کہہ سکتے ہیں۔ اتنی بڑی اخلاقی جرات شاید ہی کوئی دوسرا ادیب کر سکتا ہو۔

شاہد حمید نے اگر خود کو کہیں مرکز بنا کر پیش کیا ہے تو اس حد تک وہ ضروری تھا آخر وہ خود بھی اپنی اہمیت سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ ان میں سے زیادہ تر ان کے تعلیمی حوالے سے ہی خود کو مرکز بنایا گیا اور یہ حقیقت بھی تھی۔ جبکہ دوسری جانب دیگر آپ بیتیوں میں مصنف توجہ حاصل کرنے کے لیے اور اپنی اہمیت ثابت کرنے کے لیے نہ صرف خود کو مرکز بنانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ وہ اپنی اہمیت کو قاری پر ہر صورت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہد حمید کی آپ بیتی گئے دن کی مسافت ان تمام چرب زبانیوں سے پاک ہے جن کا عمومی طور پر آپ بیتی شکار رہی ہے۔ عموماً آپ بیتیوں میں مصنف ذاتی واقعات میں حد درجہ مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے لیکن گئے دن کی مسافت میں واقعات جس سادگی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ان میں قطعی تصنع و بناوٹ کا گمان نہیں ہوتا۔ زبان و بیان کے حوالے سے آپ بیتی سادہ ہے۔ مقامی زبان کے الفاظ سے لے کر انگریزی، فارسی، پنجابی زبان کے الفاظ کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ بلکہ کوشش کی گئی ہے کہ جو واقعہ جس انداز میں پیش آیا ہے اسے بالکل اسی طرح ہی بیان کر دیا جائے۔ جس سے آپ بیتی بہت آسان معلوم ہوتی ہے اور اسی وجہ سے قاری کی توجہ حاصل کر لیتی ہے۔ مصنف نے شعر، محاورے، ضرب الامثال کا استعمال بھی کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی اپنی زبان جسے مہاجری زبان بھی کہا جا سکتا ہے اس کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ اگر وہ چاہتے تو ان واقعات کو اردو زبان میں بھی بیان کر سکتے تھے لیکن ایسا کرنے سے شاید ان واقعات کا حسن خراب ہو جاتا یا کم از کم وہ بات اور چاشنی نہ رہ پاتی جو اس واقعہ کو اصل زبان میں بیان کرنے سے ہوتی ہے۔ آصف فرخی نے اپنے کالم میں زبان و بیان کے حوالے سے لکھا ہے:

> "The book is well swrved by the extraordinary cmmand of language and expressions the author display. Local details are presented through local expression and there is a wealth of Punjabi words employed by the author” (5)

بچپن سے ہی سکول میں پڑھنے پڑھانے کے عمل میں جو زبان بولی جاتی تھی وہ اور گھر میں جو واقعات رونما ہوتے، بیٹ میں پیش آتے ہیں ان کی اصل صحت کے ساتھ میں ان کو بیان کیا ہے۔ مثلاً

> ”اگر چہ اب بارش میں خاصی کھروند (نرمی) آگئی تھی اور صرف کوئی کنی (قطرہ) گر رہی تھی مگر دریا پوری طرح جلال میں آچکا تھا“۔(6)

اسی طرح "پانی کی زبردست چھل (موج) اٹھی"(7)

"رہی سہی کسر دریائی ہڑھ (طغیانی) کے ریلے نے پوری کر دی"(8)

یہ تمام الفاظ باقاعدہ اردو زبان کے الفاظ نہیں ہیں۔ اکثر الفاظ یا تو پنجابی زبان میں مستعمل ہیں یا پھر ان کی مقامی زبان میں جو جالندھر میں بولی جاتی تھی۔ یہی اس آپ بیتی کا حسن ہے کہ بڑے بڑے بھاری بھر کم الفاظ اور زیادہ مشکل الفاظ کے استعمال سے گریز کیا گیا ہے۔ علمی استعداد کو جھاڑنے سے گریز کیا ہے بلکہ عام الفاظ کا زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ لکھتے ہیں:

"بعض گلیاں اتنی بھیڑی (تنگ) تھیں کہ اندرون لاہور کی گلیاں بھی شرما جائیں"(9)

اسی طرح ضرب الامثال اور محاوروں کا بھی استعمال کیا گیا ہے یعنی:

"مرے کو مارے شاہ مدار"

انہوں نے آرائیوں سے متعلق مشہور ایک ضرب المثل کا خاص طور سے آپ بیتی کا ذکر کیا ہے کہ ان کے بیٹ میں مشہور تھا:

"اٹ پٹو تو بیٹھوں ارائیاں دا رشتے دار نکل آوے گا"(10)

ساتھ ہی بیٹ میں مشہور ہونیوالی کہاوتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر بیٹ میں ایک سگریٹ بہت مشہور تھی اس کے بارے میں یہ کہاوت زبان زدعام تھی:

"پانی پمپ دا سگریٹ لمپ دا"(11)

مصنف نے اس کے علاوہ انگریزی زبان کے مصنفین کے مشہور جملے اور اردو کے شعراء کے استعمال کے وہ مصرعے جو زبان زدعام ہیں لیکن زیادہ تر لوگ مکمل شعر سے ناواقف ہیں بلکہ شاعر کے نام سے بھی بے بہرہ ہیں کہ کس کا ہے۔ اس کے علاوہ پنجابی اور اردو کے الفاظ میں جو مبالغہ پایا جاتا ہے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ انہوں نے اپنے بچپن کے واقعات کو بھی اسی طرح سے قاری کے سامنے رکھا ہے جس طرح وہ پیش آئے ہیں:

"جب بچے سو تک گنتی سیکھ جاتے، پھر پہاڑے پڑھائے جانے کا عمل شروع ہوتا۔ استاد پہلے لہک لہک کر رہا (آپ اسے ترنم یا خوش الحانی کہہ سکتے ہے) سے۔ ایک دونی دو، دو دونی چار، تین تیہانو، چار تیہا بارہ، پنج پانجا پنجی، چھ چوکا چوی وغیرہ کہتا"(12)

گنتی کے الفاظ کا ذکر بھی انہوں نے پنجابی زبان میں کیا ہے حالانکہ ان کا ذکر وہ اردو میں کر سکتے تھے یا بس اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ گنتی سکھائی جاتی تھی:

مثلاً۔ تن (تین)، ست (سات)، بائی (بائیس)، تیئی (تیئس)، بتی (بتیس) چوالی یا چتالی (چوالیس)، بونجا (باون) وغیرہ۔

آصف فرخی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"He take pains to explain and offer Urdu expressions but there are occasions when this seems to turn into nitpicking." (13)

دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اس حوالے سے اکثر ابہام کا شکار ہونے والے لوگوں پر تنقید کرتے ہیں جو گنتی کے بعض ہندسوں کے درمیان فرق نہیں کر پاتے وہ لکھتے ہیں:

"تاہم بعض بندے ایسے بھی جن کی اردو بنانے سے پنجابیوں کو سخت مشکل پیش آتی ہے۔ آج بھی ٹی وی کی سکرینوں پر بعض پھنے خان سیاست دان جلد بازی یا لاعلمی کی وجہ سے سڑسٹھ کو ستاسٹھ اور اڑسٹھ کو اٹھاسٹھ کہہ جاتے ہیں حالانکہ یہ صحیح

پنجابی بھی نہیں ہے۔پنجابی میں ان کا صحیح تلفظ ستاٹھ، اٹھاٹ ہے۔ جہاں تک نواسی 89 کا تعلق ہے لوگ اسے بھی اناسی 79 بنادیتے ہیں"۔(14)

ان تمام باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف زبان پر کافی عبور رکھتے ہیں اور انھوں نے کسی بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمام واقعات کو ان کی اصل زبان میں صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اگر چاہتے تو ان تمام باتوں کو لکھنے کی بجائے وہ محض اردو میں ان تمام باتوں کا سرسری طور پر ذکر کر دیتے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ان لوگوں پر بھی تنقید کی ہے نو کہ خود کو بڑا پھنے خاں سیاست داں سمجھتے ہیں لیکن ان کو گنتی کے بھی صحیح تلفظ سے آگاہی میسر نہیں ہے۔ کس لفظ کو کیسے ادا کرنا ہے وہ لوگ اس بارے میں بھی نہیں جانتے۔ اردو کے ساتھ ساتھ انہیں پنجابی زبان پر بھی مکمل عبور حاصل ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ان پنجابیوں کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ جو پنجابی ہونے کے باوجود پنجابی تلفظ میں گنتی بھی ٹھیک طرح سے نہیں پڑھ سکتے۔ یا پھر انہیں گنتی کے تلفظ کے بارے میں صحیح علم ہی نہیں ہے یا پھر وہ اس بارے جانتے ہی نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ مشہور انگریزی مصنفین کے جملے جو محاورے اور ضرب الامثال کے طور پر مشہور ہوئے ان کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ہم کہ سکتے ہیں کہ آپ بیتی میں یہ ہر مکتبہ فکر کے حوالے سے کچھ نہ کچھ مواد ضرور شامل ہے۔ مثلاً ایل گابا کی کتاب کا مشہور جملہ انہوں نے نقل کیا ہے:

"Some people begin there morning with a cup of tea, some with aorning paper. His highness prefers a virgin".(15)

اردو مصنفین کے وہ اشعار جن کا محض ایک ہی مصرع زبان زد عام رہا ہے لیکن دوسرا مصرعہ قارئین نے یاد کرنے کی زحمت ہی نہیں کی وہی ایک مصرعہ ضرب المثل کے طور پر پر مشہور ہو گیا جبکہ اس کے شاعر کا نام بھی لوگوں کو معلوم تک نہیں لیکن شاعر سے زیادہ وہ جملہ لوگوں کے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا۔ وہ غزلیں جو کہ مشہور ہوئیں مگر ان کے مصنفین اور شاعروں کے نام لوگوں کو نہیں معلوم ان کا ذکر بھی آپ بیتی میں شامل ہے۔ مثلاً حسرت موہانی کی مشہور غزل ہے:

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے

اس کے علاوہ چند مشہور مصرعوں کو ان کے مکمل شعر اور اس کے شاعر کے نام کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جو درج ذیل ہیں:

تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں — مادھو رام جوہر (16)

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا — جہاں دار شاہ (17)

آپ بیتی میں شادی بیاہ کے لوک گیتوں کا تذکرہ بھی شامل ہے مثلاً

"نی ویر میرا گھوڑی چڑھیا" (18)

اس کے علاوہ ایسے الفاظ کا بھی استعمال ہے جو کہ خالص مقامی زبان کے الفاظ ہیں ان الفاظ کو جوں کا توں بیان کر دیا گیا ہے مثلاً:

داج (جہیز)، ووہٹی یا بوہٹی (دلہن)، وری (بری)، وغیرہ کے الفاظ شامل ہیں۔ مصنف نے آپ بیتی میں زیادہ تر عوامی لہجے کے قریب رہ کر عوامی زبان میں ہی آپ بیتی لکھی ہے۔ اس کے علاوہ ایسے بے شمار الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے جو کہ اردو زبان کے نہیں ہیں لیکن عام زندگی میں مستعمل ہیں مصنف نے ان الفاظ کو اردو میں لکھنے کی بجائے اسی زبان میں بیان کر دیا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ قاری ان الفاظ سے زیادہ مانوس ہے اور پھر شاید وہ بھی اس تجربہ سے گزرا ہو تو اس کا ماضی بھی اس کے سامنے آجاتا ہے۔ الغرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان و بیان کے حوالے سے آپ بیتی نہایت ہی شان دار ہے اس میں کسی قسم کے پر شکوہ الفاظ کا استعمال نہیں کیا گیا اور نہ ہی علمی دھاک بٹھانے کی سعی کی گئی ہے بلکہ تمام الفاظ کو اور واقعات کو جیسے پیش آئے ویسے ہی بیان کر دیا گیا ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ آپ بیتی میں جو واقعات انہوں نے لکھے ہیں ان میں سے اکثر

واقعات جو کہ اہم ہیں ان کے اصل ناموں کی بجائے فرضی ناموں کے ساتھ ان واقعات کو بیان کیا ہے تاکہ ان کرداروں یا ناموں کو اگر کو لوگ جانتے بھی ہوں تو ان کے کردار پر برا اثر نہ پڑے۔ آپ بیتی میں اکثر جگہوں پر کسی ناول کا گمان ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی آپ بیتی کا نہیں بلکہ کسی ناول کا حصہ ہے جس سے قاری کے ذہن میں مزید تجسس ابھرتا ہے اکثر واقعات میں بھی ناول کا عکس نظر آتا ہے مثلاً آپ بیتی کا آغاز ہی ناول کے انداز میں ہوتا ہے اور محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ کوئی آپ بیتی ہے بلکہ یوں لگتا ہے کہ کسی ناول کا حصہ ہے۔ مثال کے طور پر آپ بیتی کا پہلا پیراگراف تو بالکل کسی ناول کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ 'اڑاڑ ادھم، اڑاڑ ادھم، دیوار میں تریڑ آئی، بڑا شگاف بنا، دیوار زمین بوس ہوئی اور اپنے ساتھ چھت کو بھی لے ڈوبی:

> "اڑاڑ ادھم، اڑاڑ ادھم پھر دیواروں میں تریڑیں آنے، شگاف بننے اور ان کے زمیں بوس ہونے کا تانتا بندھ گیا۔ کبھی اکیلی دکیلی کا اور کبھی کئی ایک کا بیک وقت ایک دوڑ لگی ہوئی تھی کہ کون سب سے پہلے اپنی دھرتی ماں کو آغوش میں جاتی ہے دیکھتے ہی دیکھتے ہنستے بستے گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور وہ یوں صفحہ ہستی سے ناپید ہو گیا جیسے اس کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔"(19)

اس سارے پیراگراف میں ایک ناول کی جھلک معلوم ہوتی ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف آپ بیتی کے بجائے کسی ناول کا آغاز کرنے لگا ہے اور آغاز میں ہی اتنا تجسس ہے کہ اگر کسی ناول کا آغاز اتنا متجسس ہو گا تو پھر اس کا انجام کیسا ہو گا اور اس کی کہانی کسی انداز کی ہو گی۔ بہر حال یہ مصنف کا کمال ہے کہ وہ آغاز کیسا فراہم کرتا ہے کامیاب تخلیق وہی ہوتی ہے جو آغاز سے ہی قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لے اور قاری کی توجہ اس سے ایک پل نہ ہٹے اگر تحریر تخلیق قاری کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہے تو اس کا مطلب مصنف بھی قاری کی توجہ حاصل نہیں کر سکا۔ اس کے علاوہ آپ بیتی میں گاہے گاہے بیان کیے گئے واقعات بھی اپنے اندر ناول کا رنگ لئے نظر آتے ہیں۔ وہ واقعی ناول کا ٹکڑا معلوم ہوتے ہیں اور مصنف نے انہیں اس کمال مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ آپ بیتی کے بجائے کسی ناول کا جز معلوم ہوتے ہیں۔ ظاہر سی بات ہے ایک آپ بیتی اپنے اندر بہت سے رنگ لیے ہوتی ہے اور بہت سی جہتوں کا احاطہ کیے ہوتی ہے گئے دن کی مسافت میں بھی یہی عناصر شامل ہیں۔ مثلاً ایک جگہ وہ بیان کرتے ہیں:

> "یہ لوگ جب اپنے گھروں سے باہر نکلے اور امریکہ کے سفر پر روانہ ہوئے تھے تو سبھی کے سبھی کنوارے تھے۔ امریکہ میں کئی سال گزارنے کے بعد انہیں نہ صرف وطن کی یاد بلکہ یہ احساس بھی ستانے لگا تھا کہ اچھی اور بھرپور زندگی کیلئے عورت کی رفاقت بھی زبردست کردار ادا کرتی ہے۔ چنانچہ وہ ایک ایک کر کے اپنی جمع جتھا سمیٹنے اور واپس آنے لگے۔ آخر میں صرف ایک شخص باقی رہ گیا اور وہ آخری سانس تک تجرد کی زندگی بسر کرتے کرتے وہیں ڈٹا رہا۔"(20)

جیسے ایک ناول میں کئی کہانیاں ایک ساتھ چلتی نظر آتی ہے. اس آپ بیتی میں بھی کچھ ایسے ہی اجزاء شامل ہیں۔ بعض واقعات حقیقت میں تجسس سے اس قدر بھرپور ہیں کہ ان میں حقیقی طور پر ناول کے کسی واقعہ یا کردار کا گمان ہوتا ہے یا پھر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ واقعہ ناول کے کسی واقعہ کو سامنے مد نظر رکھتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔ حالانکہ مصنف نے کمال مہارت کے ساتھ واقعات کو اس خوبصورتی کے ساتھ آپ بیتی کی زینت بنایا ہے کہ اس میں قاری کی دلچسپی ختم ہونے کے بجائے مزید بڑھتی ہے۔ تجسس اور مزید جاننے کی تگ و دو جب بڑھتی ہے تو پھر وہ اس تحریر اور تخلیق کو کبھی بھی ادھورا نہیں چھوڑتا اور یہی اصل تحریر اور تخلیق کی خوبی ہوتی ہے کہ اس میں واقعات کو اس انداز کے ساتھ بیان کیا جائے کہ ان میں حقیقت کا گمان ہونے لگے۔ آپ بیتی میں شامل اکثر سیاسی واقعات، جلسے، سیاسی محفلوں، کا ذکر بھی ناول کے انداز میں کیا گیا ہے

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی تاریخی ناول کا ذکر چل رہا ہے. اکثر اوقات ایسے واقعات اور ان کا تذکرہ عبداللہ حسین، قراۃ العین حیدر، عبدالحلیم شرر، نسیم حجازی کے تاریخی ناولوں میں ملتا ہے۔

آپ بیتی کے حوالے سے دیکھا جائے اور ان مصنفین کے ناولوں کا مطالعہ کیا جائے جن میں اداس نسلیں، نادار لوگ، آخر شب کے ہم سفر، آگ کا دریا، محمد بن قاسم جیسے شہرہ آفاق ناول شامل ہیں۔ ان میں واقعات اسی ترتیب کے ساتھ لکھے گئے ہیں جیسے اس آپ بیتی میں شاہد حمید نے بیان کیے ہیں بلکہ اسی طرح کے واقعات گرد راہ از اختر حسین رائے پوری، شہاب نامہ از قدرت اللہ شہاب، اپنا گریباں چاک از ڈاکٹر جاوید اقبال کی آپ بیتیوں میں بھی شامل ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اکثر آپ بیتوں میں ناول کا یہ رنگ نمایاں نظر آتا ہے یا یوں کہیے کہ یہ آپ بیتی کا ایک حسن ہے کہ باتوں کو اور واقعات کو اس انداز سے بیاں کیا جائے کہ اس میں کہانی کا عنصر حاوی نظر آئے بلکہ قاری کی دلچسپی بھی اس میں نظر آئے اس میں زیادہ تاثر ناول یا کہانی کا اس لیے دیا جاتا ہے تاکہ قاری اکتاہٹ کا شکار نہ ہو کیونکہ کوئی بھی بڑی تحریر یا تخلیق ایک ہی نشست میں تو مکمل پڑھی نہیں جاتی اور پھر اس میں قاری کے مزاج کے مطابق اگر واقعات کو ترتیب نہ دی جائے تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو جاتی ہے۔ یہ مصنف پر منحصر ہوتا ہے کہ آخر وہ کس طرح سے اور کن حربوں کو استعمال کرتے ہوئے قاری کی توجہ حاصل کر پاتا ہے اس کے لیے آپ بیتی میں ہر طرح کا رنگ استعمال کیا جاتا ہے جو کہ ایک مثبت عمل ہے۔ آپ بیتی میں کہیں کہیں واقعات میں افسانہ کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے بعض واقعات کا انداز بیان ایسا ہے کہ وہ بالکل کسی افسانہ کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ اکثر تو کسی شخص کا پورا واقعہ اور کہانی جب بیان کرتے ہیں تو اس پر افسانہ کا گمان ہوتا ہے اور اس پہ دلچسپ بات یہ ہے کہ واقعہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے اس واقعہ کے فٹ نوٹ پر لکھا ہے کہ اس واقعہ کے تمام کرداروں کے نام تبدیل کر دیئے گئے ہیں۔ واقعات حقیقت پر مبنی ہیں ان میں سچائی اپنی طرح برقرار ہے لیکن ان کا انداز بیان ایسا افسانوی رنگ دیتا ہے جیسے جیسے واقعہ آگے بڑھتا ہے قاری میں مزید تجسس پیدا ہوتا رہتا ہے۔ بالخصوص زہرہ، محمد اسحق، نصیر احمد، زہرہ کے بھائی کا مکمل واقعہ تو ایک پورا افسانہ معلوم ہوتا ہے مصنف نے اسے اس خوبصورتی کے ساتھ قلمبند کیا ہے کہ وہ ایک پر تجسس واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس واقعہ کو آپ بیتی سے الگ کر دیا جائے تو یہ واقعہ ایک مکمل افسانہ بن سکتا ہے اس افسانوی واقعہ میں کرداروں کے نام فرضی ہیں باقی آغاز سے لے کر انجام تک افسانے کی ہر صفت اپنے اندر لیے ہوئے ہے جیسے ایک افسانے کا آغاز ہوتا ہے۔ ویسے ہی آغاز ہوتا ہے وہی آغاز وسط اور ویسا ہی انجام ہے بلکہ انجام بھی المیہ ہے اور المیہ بھی زہرہ کا ہے قاری کو واقعہ پڑھنے کے بعد دلی طور پر نصیر احمد اور زہرہ کے بھائی پر غصہ آتا ہے جبکہ زہرہ کے لئے ہمدردی کا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے یہ واقعہ حقیقی طور پر ایک المیہ افسانہ محسوس ہوتا ہے۔ کرداروں میں مطلبی پن، خود غرضی کے عنصر کے حوالے سے اس میں نصیر احمد اور زہرہ کے بھائی کے کردار قابل ذکر ہیں۔

> ”نصیر احمد کے کردار کے بارے میں وہ یوں بیان کرتے ہیں اس نے ایک روز باتوں باتوں میں مجھے بتایا میں دو چیزیں بالکل نئی نکور اور ان چھوئی چاہتا ہوں ایک کتاب اور دوسری عورت دوسری کو چگلی ہوئی اور سیکنڈ ہینڈ اشیا مجھے قطعاً پسند نہیں“۔(21)

اس ایک جملے سے نصیر احمد کے کردار کا تجزیہ کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے کہ وہ کسی قسم کی ذہنیت کا حامل تھا۔ آپ بیتی میں اس کے علاوہ بھی کئی کردار ایسے ہیں جن کی اصلیت کچھ اور ہے جبکہ وہ اپنی ذات میں خود کو کچھ اور ہی ظاہر کرتے نظر آتے ہیں اس سارے واقعے میں نصیر احمد کی خود غرضی اور بھائی کی لاپرواہی کا سارا نزلہ بالآخر زہرہ پر گرا اس نے اس جرم کی سزا پائی جو اس نے کیا ہی نہیں تھا اور سزا بھی ایسی کہ کوئی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور بھائی بہن کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتا ہے یہ بات بھی قاری کی سمجھ سے بالاتر ہے لیکن دنیاداری ہے سب کچھ ممکن ہے ظاہر ہے

کہ یہ مصنف کا ذاتی تجربہ ہے وہ خود اس تجربہ سے ہو گزرے ہیں اسے لیے اس بات کو جھٹلانا ممکن نہیں ہے زہرہ کے المیہ کے بارے میں وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> "نصیر احمد کی وعدہ خلافی پر محمد اسحق کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے بہتیری کوشش کی مگر وہ اپنی بیٹی کا رشتہ کسی دوسری جگہ کرنے میں ناکام رہا پاکستان بننے کے کچھ عرصے پہلے اس کا انتقال ہو گیا زہرہ اپنے بھائی کے ساتھ پاکستان آگئی مگر بھائی نے یہاں پہنچتے ہی آنکھیں بدل لیں۔ پرجیاں کلاں میں اسے پھر بھی برداری کا خوف تھا یہاں کون پوچھنے والا تھا اس نے بہن کو اپنے پاس رکھنے سے صارف انکار کر دیا زہرہ کے ہوش ٹھکانے آ گئے وہ بہتیرا روئی پیٹی، چیخی چلائی مگر بھائی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر ایک دن وہ ساہی وال کے کسی چکلے میں بیٹھ گئی"۔(22)

کسی کا ایسا دردناک انجام جسے اس کے اپنے ہی پہچاننے سے انکار کر دیں تو پھر غیروں سے گلہ کرنا بنتا ہی نہیں ہے۔ اکثر اوقات گناہوں کا کفارہ وہ لوگ ادا کیا کرتے ہیں جو انہوں نے کیا ہی نہیں ہوتا ایسے ہی کسی گناہ کا کفارہ زہرہ نے ادا کیا جس کے بارے میں اسے خود بھی معلوم نہیں خود غرض لوگوں کی حرص کے انجام میں بالآخر نتیجہ زہرہ کو بھگتنا پڑا۔ ہر کسی نے اسے محض مہرہ بنا کر استعمال کیا اور بعد میں آنکھیں پھیر لیں قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ بعد میں محمد اسحق کی لاکھ کوششوں کے بعد بھی زہرہ کا کسی دوسری جگہ رشتہ بھی نہ ہو سکا اور باپ کے انتقال کے بعد رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی اور تقسیم پاکستان نے اس پاک سرزمین نے اسے کیا تحفہ دیا جس کا تصور بھی اس نے نہیں کیا ہو گا۔

اگرچہ آپ بیتی میں دیگر واقعات جیسے موہن کا واقعہ، محمد علی بوٹی والا، منشی محمد علی، غلام رسول اور دیگر کے واقعات میں بھی افسانوں رنگ نمایاں نظر آتا ہے جو کہ ایک مکمل المیہ ہے بلکہ ایک المیہ افسانے کے تمام اجزاء اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور پھر اس واقعہ کا دورانیہ بھی ایک مکمل افسانے پر مشتمل ہے اور پھر اس کا انداز بیان کرداروں کے رنگ بدلتے چہرے سب کچھ افسانوی انداز میں ہو نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے مصنف نے جو کچھ دیکھا محسوس کیا تجربہ کیا اسے اسی طرح اپنی آپ بیتی کا حصہ بنا دیا۔ اکثر اوقات قاری کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ عین ممکن ہے کہ واقعہ جھوٹ پر مبنی ہو یا اگر سچ بھی ہو تو ہو سکتا ہے کہ اس کا انجام یہ نہ ہوا ہو جو کہ مصنف نے بیان کیا ہے۔ اس بابت انہوں نے ابہام کی تمام صورتحال کو ختم کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "میرا راوی انتہائی معتبر ہے اسے کسی صورت جھٹلانا ممکن نہیں تھا۔"(23)

واقعات کی سچائی اور ان کا انداز بیان اپنے لحاظ سے بالکل منفرد ہے اس واقعہ کے علاوہ بھی اگر دیگر واقعات کا جائزہ لیا جائے تو ان میں بھی مکمل نہ سہی مگر تھوڑا بہت ضرور افسانے کا رنگ نمایاں نظر آئیگا جو کہ مصنف کے انداز بیاں اور ان کی مہارت کی وجہ سے ہے انہوں نے واقعات کو اس انداز سے قلمبند کیا ہے کہ آپ بیتی کی چاشنی اور قاری کی دلچسپی اس میں مزید گہری ہوئی نظر آتی ہے ایک انداز ہوتا ہے کہ صرف واقعہ کو بیان کرنا ہے لیکن ایک انداز درست اور حقیقت پر مبنی واقعہ کو اس انداز بیان کیا جائے قاری کے دل پر اثر کرے اور پھر اگر بیان کرنے والے مصنف جیسا ذمہ دار شخص ہو تو اس واقعہ کی صحت سے قطعی انکار نہیں کیا جاتا ممکن ہے کہ اکثر آپ بیتیوں میں افسانوی رنگ کو محض۔ آپ بیتی کی رونق بڑھانے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ اس کی وجہ سے قاری اکتاہٹ کا شکار ہو اس لیے آپ بیتی میں ایسے واقعات، المیہ اور طربیہ جیسے واقعات کو شامل کیا جاتا ہے پھر ان میں افسانوی، ناول کا رنگ دے کر ان کے تاثر کو مزید ابھارا جاتا ہے اکثر اوقات مصنف اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے لیکن شاہد حمید صاحب کی آپ بیتی میں ہر چیز کی طرح ہر واقعہ حقیقت نگاری اور حقیقت کے قریب ترین بلکہ ان کے ذاتی تجربے کا حصہ ہے انہوں نے تمام واقعات کو خواہ وہ بچپن کے ہوں تعلیم کے ہوں عزیز و اقارب کے ہوں یا خواہ جیسے بھی ہوں مکمل حقیقت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے

اپنے قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے یہ ایک الگ بات ہے کہ ان کے انداز بیان میں اس واقعہ میں افسانہ یا ناول کی جھلک نظر آتی ہے یا اس میں ناول یا افسانہ کا رنگ نمایاں ہو جاتا ہے ایک مصنف کی کامیابی ہوتی ہے کہ جب اس کی تحریر، تخلیق کو قاری دلچسپی، دلجمعی کے ساتھ پڑھتا ہے اور ان واقعات میں اور انداز بیان میں اتنی کشش ہوتی ہے کہ وہ قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالیتے ہیں۔ تاہم تمام حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے کم از کم اس بات کو حقیقت تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ مصنف نے واقعات میں زیادہ اگر کوئی تبدیلی کی ہے تو وہ یہ ہے کہ کرداروں کے نام بدل دیئے ہیں ورنہ واقعات اپنی صحت اور حقیقت کے حوالے سے جوں کے توں بیان کیے گئے ہیں اور کرداروں کے نام تبدیل کرنے کا اعتراف بھی انہوں نے کیا ہے کہ جہاں اس واقعہ میں کرداروں کے نام فرضی ہیں اصل ناموں کو تبدیل کر دیا گیا ہے جو کہ اس بات کی دلیل ہے کہ مصنف نے تمام واقعات اپنی مکمل حقیقت کے ساتھ قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

آپ بیتی میں زندگی کے تمام پہلوؤں پر قلم اٹھایا گیا ہے سیاست، تاریخ، ہجرت وغیرہ۔ انہی میں سے ایک موضوع مذہب بھی ہے، مذہبی حوالے سے علماء کرام کا ذکر مصنف کی مذہب کے ساتھ وابستگی کو ظاہر کرتا ہے۔ آپ بیتی میں زیادہ تر علمائے دیوبند کا ذکر کیا گیا ہے جس سے ان کی علمائے دیوبند کے ساتھ محبت اور عقیدت کا پتہ چلتا ہے لیکن یہ امر لائق تحسین ہے کہ مصنف تعصب سے بالکل پاک عقائد رکھتے ہیں۔ وہ آپ بیتی میں ناصر کاظمی اور انتظار حسین جیسی شیعہ مسلک کی شخصیات سے بھی اپنی دوستی اور دلی وابستگی کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں آپ بیتی کا آغاز میں ہی وہ اپنے خاندان کی علمائے دیوبند کے ساتھ وابستگی کو بیان کرتے ہوئے اپنے تایا جان کا ذکر کرتے ہیں:

> "مسلک کے اعتبار سے تایا جان دیوبندی تھے۔ انہوں نے اہلسنت و الجماعت کے نام سے ایک تنظیم بھی بنا رکھی تھی"۔(24)

اسی طرح ایک اور جگہ بیان کرتے ہیں:

> "تایا جان کے بڑے بڑے علماء سے تعلقات تھے وہ مولانا احمد علی لاہوری کے مرید تھے اور خیر المدارس جالندھر کے بانی اور مہتمم مولانا خیر محمد سے تو ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ ان کی دعوت پر مولانا آخری جمعہ پڑھانے اور وعظ کرنے ہمارے گاؤں آتے رہتے تھے۔"(25)

اس کے علاوہ دیگر علمائے دیوبند کا تذکرہ ان کی دینی خدمات اور قیام پاکستان کے حوالے سے ان کی خدمات کا بالخصوص ذکر کیا ہے اسی حوالے سے انہوں نے سید محمد میاں کی کتاب "علمائے ہند کا شاندار ماضی" کا حوالہ بھی دیا ہے کہ جس میں ہندوستان کے ہر مسلک کے علماء کے کارناموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے. اس حوالے سے وہ یوں لکھتے ہیں:

> "سید محمد میاں کی علمائے ہند کا شاندار ماضی میں ہندوستان کے تقریباً ہر ملک کے علما کے کارناموں کی تفصیل بیان کی گئی تھی اس کا آغاز مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی سے ہوا تھا اور اختتام حسین احمد مدنی پر یہ کتاب پڑھتے اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ کچھ یاد نہیں رہا کہ اس میں کیا کچھ تھا تاہم اتنا ضرور یاد ہے کہ اس میں مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا زکریا کاندھلوی مہاجر مکی، مولانا محمود الحسن اور مولانا محمد حسین احمد مدنی جیسے اکابرین دیوبند کا ذکر بہت شرح وبسط سے کیا گیا تھا"۔(26)

شاہد حمید نے برصغیر پاک وہند کی سب سے بڑی دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ دارالعلوم کے بارے میں بیان کرتے ہوئے اپنی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ مولانا نانوتوی کو انگریز اور انگریزی سے سخت چڑ تھی وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان اپنی میراث تبھی محفوظ رکھ سکتے ہیں

اگر وہ دینی تعلیم حاصل کریں چنانچہ انہوں نے انتظار حسین کے وطن مالوف ڈبائی کے قریب ضلع سہارن پور کے ایک گاؤں دیوبند میں مولانا رشید احمد گنگوہی کے تعاون سے دینی مدرسے کی بنیاد رکھی جو بعد میں ایک تناور درخت بن گیا اور ایک علیحدہ مسلک کی حیثیت اختیار کر گیا اور مسلمانان ہند پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ مصنف نے بالخصوص مولانا نانوتوی کی شخصیت کو سراہا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ کسی کو بھی مولانا کی شخصیت سے لاکھ اختلاف ہو سکتا ہے لیکن مولانا کی محنت اور ان کے کام سے کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ مولانا نانوتوی سر سید احمد خان کے ہم درس بھی تھے اور دوست بھی تھے لیکن دونوں کا انداز الگ الگ بلکہ ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ تھا لیکن اس کے باوجود ان کی دوستی میں کسی قسم کی کوئی بھی رکاوٹ نہ آئی۔ مولانا نانوتوی اپنے عہد کی ایک عہد ساز شخصیت تھے وہ محض باتیں ہی نہیں کرتے تھے بلکہ خود بھی عمل کرتے تھے کوئی بھی بات ان کے عمل سے خالی نہ تھی وہ وہی بات کرتے تھے جس پر عمل کیا کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی تشکیل اور بنیاد کے بعد مولانا نانوتوی محض چار سال ہی زندہ رہے لیکن ان چار سالوں میں وہ دارالعلوم کو اس بنیاد پر استوار کر گئے کہ آج تک پوری دنیا میں دارالعلوم کا ایک نام اور مرتبہ ہے۔ نانوتوی کے بارے میں ایک واقعہ ایسا ہے جو واقعی ان کی اعلیٰ ظرفی اور ان کے عمل کا منہ بولتا ثبوت ہے شاید آج ہم بھی ایسا نہ کر سکیں اور غلطی تسلیم نہ کر سکیں جو مولانا جیسی عظیم المرتبت شخصیت نے کیا ہم اپنی غلطیوں کو ڈھانپنے کیلئے بہانے تراشتے ہیں لیکن مولانا صاحب نے نہ صرف یہ کہ بات کو سنا بلکہ فوراً اس پر عمل بھی کیا۔ واقعہ کچھ یوں نقل کیا گیا ہے۔

> "کتاب میں ان کے متعلق لکھا گیا تھا کہ ایک مرتبہ وہ ایک جلسہ عام میں تقریر کر رہے تھے اور مسلمانوں کو تلقین کر رہے تھے کہ وہ ہندوؤں کی تقلید میں اپنی بیوہ بہنوں اور بیٹیوں کو گھروں میں نہ بٹھائے رکھیں بلکہ ان کی شادیاں کریں اس پر حاضرین میں س ایک شخص اٹھا اور اس نے اعتراض کیا کہ خود آپ کی بیوہ ہمشیرہ گھر پر بیٹھی ہوئی ہے۔ مولانا نانوتوی نے اس اعتراض کو خندہ پیشانی سے قبول کیا حالانکہ ان کی ہمشیرہ اس وقت تقریباً 60 سال کی ہو چکی تھی انہوں نے ایک ہفتے کے اندر اندر ان کی شادی کر دی اور خدا کی قدرت دیکھیں کہ وہ اس عمر میں بھی صاحب اولاد ہو گئیں"۔(27)

یہ ان لوگوں کا ہی خاصہ تھا کہ اعتراض کو خندہ پیشانی سے قبول کیا اور غلطی کو تسلیم کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی لاج بھی رکھی۔ اس کے علاوہ مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع کا ذکر بھی شامل ہے مفتی محمد شفیع کے بارے میں لکھا ہے:

> "اردو کے نامور نقار، مترجم اورافسانہ نگار محمد حسن عسکری مفتی محمد شفیع کے مرید تھے اور مفتی صاحب کے ایما پر انہوں نے مولانا کی تفسیر قرآنی کے کچھ حصوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا"۔(28)

مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کے مرید مولانا شبیر احمد عثمانی کی جماعت جمعیت علمائے اسلام پر ان کی وفات کے بعد مفتی محمود اور ان کے چہیتے مولانا فضل الرحمن قابض ہو کر بیٹھ گئے حالانکہ ان کا اس جماعت سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب بہشتی زیور بھی بہت مشہور تصنیف ہے جو کہ اکثر شادی بیاہ میں تحفہ میں دی جاتی ہے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا ڈیوس کے شعبہ تاریخ کی صدر باربرا مٹکاف نے کیا تھا۔ مولانا حسین احمد مدنی کے متعلق بیان کیا ہے کہ انہوں نے محض ایک ماہ میں مکمل قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ وہ ہر روز ایک سپارہ حفظ کرتے اور تراویح میں سناتے تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی دو قومی نظریہ اور تقسیم ہند کے خلاف تھے۔

مصنف نے اس بابت لکھا ہے:

"وہ دو قومی نظریئے اور تقسیم ہند کے مخالف تھے ان کا خیال تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیں نسل یا مذہب کی نہیں بلکہ وطن کی بنیاد پر بنتی ہیں۔ اس پر علامہ محمد اقبال نے ان کے خلاف حسین احمد کے نام سے نظم لکھی جو کہ مجموعہ کلام ارمغان حجاز میں شامل ہے اس نظم کو تحریک پاکستان کے دوران بہت اچھالا گیا میں اور میرے دوست تحریک پاکستان کے زبردست حامی تھے اور اسے پڑھ کر بہت حیران ہوتے تھے جب ہم نے مذہب کے نام پر وطن حاصل کر لیا اور اسے متحد نہ رکھ سکے تو کیا اس سے مولانا مدنی کے موقف کی تائید ہوتی ہے میں اس کا فیصلہ کرنے کا اہل نہیں"۔(29)

یہ حقیقت ہے کہ اکابرین علمائے دیوبند کی دین کے لیے خدمات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ انہیں طنز کا نشانہ بنایا گیا اور ان پر طرح طرح کے الزام لگائے گئے لیکن قیام پاکستان کے حوالے سے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں اسی طرح کا ایک واقعہ کے ایل گابا یعنی خالد لطیف گابا کے بارے میں ہے جنھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی حالتِ زار پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا عنوان تھا:

Passiv voices: a penetrative study of muslims in India.(30)

"جب کے ایل گابا کو گرفتار کیا گیا تو سیالکوٹ کے ٹھیکیدار ملک سردار علی کو خواب میں حضرت محمد ﷺ کی زیارت ہوئی جس میں آپ فرمارہے تھے کہ سردار علی فوراً اٹھو صبح لاہور پہنچو اور پندرہ لاکھ کے عوض خالد لطیف گابا کی ضمانت کراؤ اس نے میرے متعلق کتاب لکھی ہے جو مجھے بہت پسند آئی ہے"(31)

لیکن ہوا یہ کہ گابا تقسیم کے بعد ہندوستان چلے گئے اور بہت سے لوگوں کو ان پر الزام تراشی کا موقع مل گیا کہ وہ کبھی دل سے مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے انہوں نے محض وقتی فوائد حاصل کرنے کے لیے اسلام قبول کیا تھا تاہم اکثر تقسیم کے بعد بھی ان کی لکھی جانیوالی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے انداز تحریر کا پتہ چلتا ہے اور ان کتابوں کے سرورق پر بھی ان کا پورا نام خالد لطیف گابا درج ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1 . "Oxford Advanced Learner's Dictionary of Current English", Oxford University Press,1998,P: 68

2۔۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، "اصناف ادب"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص:۲۶۱

3۔ سرور آل احمد، خواب باقی ہیں، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص:۸

4۔ انصاری، یوسف جمال، "آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں"، مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص:۸۷

5.Asif Farrukhi, "Recreating Yesterday", Dawn, 26 June 2016 www.dawn.com\1267186

6۔ شاہد حمید، "گئے دن کی مسافت" القاء پبلیکشنز، لاہور، ص، ۱

7۔ ایضاً، ص:۴

8۔ ایضاً، ص:۱

9۔ ایضاً، ص:۲

10۔ ایضاً، ص:۱

11۔ ایضاً، ص:۸۷

12.Asif Farrukhi, "Recreating Yesterday", Dawn, 26 June 2016, www.dawn.com\1267186

13۔ ایضاً، ص:۲۵
14۔ ایضاً، ص:۲۵
15۔ ایضاً، ص:218
16۔ ایضاً، ص:249
17۔ ایضاً، ص:250
18۔ ایضاً، ص:104
19۔ ایضاً، ص:1
20۔ ایضاً، ص:۱۸۱
21۔۔ ایضاً، ص:۲۴
22۔ ایضاً، ص:۱
23۔ ایضاً، ص:۱۲
24۔ ایضاً، ص:۸۵
25۔ ایضاً، ص:۸۶
26۔۔ ایضاً، ص:182
27. ایضاً، ص:۸۶
28ایضاً، ص:۱۸۲
29ایضاً، ص:183
30ایضاً، ص:۱۸۴
31ایضاً، ص:188

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Roman Havalajat

1. “Oxford Advanced Learner's Dictionary of Current English”, Oxford University Press,1998,P:68
2. . Hashmi, Rafiuddin, “Asnaaf-e-Adab”, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 1989, P:261
3. Suroor Aal Ahmad,, “Khawab Baqi Hain”, Fiction House, Lahore, 1999,P:8
4. Ansari, Yousuf Jamal, “Aap Beeti aur is ki Mukhtalif Soortein,” mashmoola Naqoosh, P:87
5. Asif Farrukhi, "Recreating Yesterday", Dawn, 26 June 2016 www.dawn.com\1267186
6. Shahid Hameed, “ Gaye Din Ki Musafat”, Ilqa Publications, Lahore,P:1
7. Ibid, P: 4
8. Ibid, P: 1
9. Ibid, P: 2
10. Ibid, P: 1
11. Ibid, P: 87
12. Asif Farrukhi, “Recreating Yesterday”, Dawn, 26 June 2016, www.dawn.com\1267186
13. Ibid, P: 24
14. Ibid, P : 25
15. Ibid, P: 218
16. Ibid, P: 249
17. Ibid, P: 250
18. Ibid, P: 104
19. Ibid, P : 1
20. Ibid, P: 181
21. Ibid, P: 24

22. Ibid,   P: 1
23. Ibid, P : 12
24. Ibid,   P: 85
25. Ibid, P :   86
26. Ibid,   P: 182
27. Ibid , P: 86
28. Ibid , P: 182
29. Ibid , P: 83
30. Ibid , P: 184
31. Ibid   , P: 188